غالب نما

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

بک سینٹر۔ ڈگی روڈ۔ علی گڑھ ۲/۶

دیگر تصانیف

۱ ۔ انشائے بے خبر
۲ ۔ بال جبریل مع مقدمہ و فرہنگ
۳ ۔ مکالمۂ غالب

زیر طبع :

۱ ۔ ترجمہ ذکر میر
۲ ۔ محیط آشنا تذکرۂ جدید

سال طباعت : ۱۹۷۰ء
قیمت : دو روپے پچاس پیسے

ناشر : بک سینٹر ۔ ڈگی روڈ ۔ علی گڑھ ۲

(یونین پرنٹنگ پریس دہلی)

انتساب

غالب
کے شاگردِ عزیز
جدی سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مرحوم
کی
ادبی قدسوں و علمی فراست
کے حضور
کہ
چمن کا جلوہ باعث ہے تری رنگین نوائی کا

فہرست

غالب نما

غالب کی شخصیت ہمہ رنگ وہمہ صفت اور شوخ وشنگ طبیعت کی مالک تھی۔ ان کی شخصیت کے تابناک وتاریک رخ ان کے خطوط کے خدوخال میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ کیوں کے ان کے خطوط ان کے حال قال کے آئینہ دار ہیں۔ غالب نما کو ان کے اس ہی سلسلے سے مربوط کیا گیا ہے۔

چند سال قبل خطوط غالب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ خیال میں بعض واقعات نے جگہ کی اور دل نے طے کیا کہ دماغ کی اس رائے سے متفق ہونا چاہئے کہ غالب نے جو کچھ کہا ہے اس کے ان پہلوؤں پر تنقیدی نظر ڈالی جائے جن سے کار آمد اور روشن پہلو سامنے آئیں۔ اس لئے جس جگہ نگاہ ٹھہری اور قلب متاثر ہوا اس کو قلم بند کر لیا گیا۔ غرض یہ کہ عنوان میرا پا ئی ان کا وہ جو گوہر مقصود کی تلاش میں سرگرداں رہا اور معنی آفرینی کا شہنشاہ کہلایا۔ وہ جو محیط آشنا بھی تھا اور صنعت گر بھی۔ وہ جس کی نظر گردش ماہ وسال پر بھی اور رعنائی خیال پر بھی۔ اگرچہ غالب کی تجدد فکری اور بلاغت ذہنی۔ ایجاد وایجاز کی حدود سے بھی ماورا تھیں۔ اگرچہ کوئی ضروری نہیں کہ اس رائے سے ہر شخص متفق ہو۔ لیکن

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی،

دیر وحرم۔ تکرار تمنا۔ واماندگی شوق، قید حیات اور بند غم

دیدۂ خون بار اور بلند فکری۔ عشرتِ قطرہ کا تصور اور نشاطِ کار و نقش وفا۔ سادگی و پرکاری۔ بے خودی و ہشیاری، تغافل و حیلات، آبلہ پائی و شوخیِ دیدہ مری، صحرا پیمائی اور اس کی پرخاری، اہلِ جفا اور ان کی داد و ستیزانی کے تیر و نشتر غالب کے کلام اور ان کے خطوط کی علامت و شاہکار ہیں۔ اگرچہ وہ یہی کہتے رہے۔

عارف ہمیشہ مستِ مے ذات چاہیے

لیکن کب۔؟

جب لختِ جگر دیدۂ خون بار میں آوے

اور لختِ جگر کا دیدۂ خوں بار میں آنا۔ صاحبِ نظر اور صاحبِ کمال پر منحصر ہے۔ صاحبِ کمال کے لیے دیدۂ بینا ہونا شرطِ اول ہے۔ دیدۂ بینا کے لیے مطالعہ شرطِ آخر۔ اور مطالعہ کے لیے خونِ جگر کا پینا بلکہ خون ہو جانا لازمی و لابدی ہے۔ انہی عناصر کی یکجائی کا نام میر تقی نے شعر قرار دیا تھا۔ اور ایک مصرعہ تر کے لیے جو بات کہی تھی وہی غالب کے خطوط اور ان کی شاعری کے لیے کہی جا سکتی ہے۔ میر کا شعر ہے۔

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعہ تر کی صورت

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

عکسِ غالب

ہر جسم دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ ظاہری اعضاء و جوارح کا رہین منت، مگر باطنی روح و خیال پر منحصر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص کے دو جسم ہوتے ہیں۔ ایک ناطق اور دوسرا بے نطق۔ جسم ناطق تو لوگوں میں دوڑنے پھرنے والے خون کا مرہون ہوتا ہے یہ بولتا ہے۔ سنتا بھی ہے، کہتا بھی ہے اور سناتا بھی ہے۔ لیکن بے نطق جسم صرف سایہ ساکت کہلاتا ہے۔ سایہ نہ دیکھنے کی قدرت رکھتا ہے۔ نہ سننے کی وہ تابع ہوتا ہے جسم ظاہری کا۔ غالبؔ کی شخصیت بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ چنانچہ ان کا جسم ظاہری یعنی نظریہ ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن جسم باطنی یعنی ان کی تحریر ہمارے پاس موجود ہے۔ حالانکہ انسانی صفت میں اس کا سایہ خاموش و ساکت رہتا ہے۔ انسان خود کلام کرتا ہے۔ مگر غالب کے یہاں یہ حقیقت بدل گئی ہے۔ وہ خود خاموش ہو گئے لیکن ان کی تحریر اب بھی گویا ہے۔

پکاسو نے کہا تھا کہ میں لوگوں کی توجہ ادھر منعطف کرنی چاہتا ہوں جس طرف انہیں دیکھنے کی عادت نہ ہو۔ غالب کا حال و نظریہ بھی ایسا ہی ہے۔ وہ تہہ دار باتیں اور معاشرتی تضادات۔ سیاہ و سفید آدم و شیطان۔ خدا اور ناخدا۔ دین و دنیا۔ عقبیٰ و آخرت کی باتیں کچھ اس انداز میں بیان کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ جس سے ہر

بالغ نظر اپنے آئینۂ خیال کے بجائے۔ ان کے نگار رخانے کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ خود بہ ہنگی کے مجرم ہوتے ہوئے بھی ہر آن نئے لبادے میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ صفت ان کے سوا اردو کے کسی اور شاعر میں یکجا نہیں ہو سکی۔ اسے ہم خوبی بھی کہہ سکتے ہیں اور فنکاری بھی۔

چنانچہ، غالب نما، کے یہ تراشے ان کے ایسے ہی لبادے ہیں۔ جن میں وہ مستور بھی ہیں اور عریاں بھی۔ وہ خارجی و داخلی رشتے سے ہم کنار بھی دکھائی دیتے ہیں اور بیگانہ بھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ سے انسانی سیلاب اور اس کی بے مائگی کا مذاق اڑانے میں پیش پیش بھی رہتے ہیں اور اس کی غم زدہ زندگی پر اپنے آنسوؤں کو نچھاور کرنے میں بھی کوتاہی یا عار نہیں محسوس کرتے۔ وہ لمحہ۔ وقت اور زمان و مکاں کو کچھ اس طرح نئی زندگی کی بشارت دیتے ہیں کہ سننے والا ان کو پیغمبر تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بسا اوقات وہ اپنے عرفانی شعور کے باوجود ہوش مندی کا ثبوت نہیں دیتے مثلاً شراب پیتے ہیں۔ نماز نہیں پڑھتے۔ مگر شراب پینے کو گناہ اور نماز نہ ادا کرنے کو بھی گناہ تصور کرتے ہیں اور اس کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ یہی نہیں کبھی کبھی وہ کئی لبادے میں لپٹے نظر آتے ہیں، بلکہ بیک وقت کئی چہرے لگائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اس بہروپ سے ان کی مشقت کا علم ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ ان کی تہہ داری اور دو بدن ہونے پر حیرت نہیں ہوتی بلکہ ہم اسے سایہ دار دھوپ کہہ سکتے ہیں جو نہایت درجہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے (موسم و کیفیت کے اعتبار سے)

غالب کے ان ہی دو روپ یعنی عمل و کردار نے ان کے ادبی تراشے افکار / خیالات، ذہنی تصورات، حقیقت نگاری، علمی عکس، طنز و مزاح تصوف، آرٹ، شخصیت نگاری، تخلیقی قوت، عبارت آرائی، عرفانی و ادبی شعور، فکری و روایتی تخیل، روحانی و وجدانی بصیرت، نفسیاتی و غیر نفسیاتی افکار روپ کو یکجا کرنے پر آمادہ کیا۔ یہ تراشے نہ مکمل ہیں، نہ نامکمل۔ نہ اکمل ہیں، نہ ناقص۔ بلکہ جیسے جیسے ہم ان کے ادبی شہ پاروں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی حد تک ہم ان کی طرف بڑھنے کے لئے مجبور رہتے ہیں۔ وہ گہرے اور ہلکے رنگوں میں بھی اپنی شخصیت کا عکس دکھانے سے باز نہیں آتے۔ شفاف پانی کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں ہر بات۔ ہر عضو۔ ہر شے صاف و نمایاں دکھائی دے گی۔ ماہ کامل شب چاردہم کو پانی میں اسی طرح اپنا چہرہ دکھاتا ہے" جیسے وہ آسمان کی بلندیوں سے اتر کر سر زمین پر آگیا ہو اور زمین کی نچلی سطح سے اپنا عکس آئینۂ آب کے واسطے سے دکھا رہا ہو۔ غالب بھی روایتی پرچھائیں میں کوئی نہ کوئی سودمند بات کی طرف اسی طرح اشارہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ قدم اٹھاتے ہیں تو زلزلہ نہیں آتا مگر جب قدم رکھتے ہیں تو دل کے نہاں خانے میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ یہی بات ان کو حیوان ظریف کہلانے پر مجبور رہی ہوگی۔ کیونکہ المیہ و طربیہ، داغ دل، غم یار سب نے مل کر غالب کی مکمل ذہنی تشکیل کی تھی اور ان ہی اسباب نے مل کر ان کو تاریخی شخص بنا دیا تھا۔ چنانچہ خود کہتے ہیں۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو ؎ یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

یہ خیال محض شعری تخیل و پیکر نہیں ہے بلکہ اس سے ان کی بالغ نظری اور غائر مطالعہ کا علم و عرفان ہوتا ہے۔ اسی طرح طنز و مزاح کے لیے انہوں نے صرف بندوں کو منتخب نہیں کیا تھا۔ وہ اس ارفع و اعلیٰ ذات کے حضور بھی تمسخر سے باز نہیں آتے۔ جس کے آگے شاہوں کے سر جھکتے اور فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شوخی و ظرافت سے خدا کو بھی معاف نہیں کیا۔ ویسے یقین ہے کہ خدا انہیں ضرور معاف کر دے گا، کہ وہ رحیم ہے۔ کریم ہے۔ چند اشعار ان کی ظرافت و شوخی کے ملاحظہ ہوں۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب	خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہیئے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن	دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد	یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد	مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں	ایسی جنت کا کیا کرے کوئی ؟
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز	سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہے
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق	آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا ؟

ان اشعار میں نیا آہنگ، نیا تصور، نئے انداز کا تخاطب اور جدید رجحان و ترقی پسند ذہن و افکار کی جو قسم ملتی ہے۔ وہ غالب سے پہلے یا ان کے عہد میں نہ تھی۔ اس انداز میں جو لطافت ہے وہ روایتی طنز ہی نہیں ہے بلکہ کمال ہوشیاری و ہنرمندی اور بے خوف انسان ہو کر وہ سب باتیں کہہ گئے ہیں جو جسم ظاہری کی حالت میں نہیں کہہ سکتے تھے۔ مروت۔ اخلاق اور پاسداری کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔

اسی طرح دنیاوی معاملات اور اس کی نزاکتوں سے آگاہ ہونے کے باوصف وہ مذہبی انسانوں پر جب حملہ آور ہوتے ہیں تو براہ راست غضبناک ہونے کے بجائے مفسر قدرت کا روپ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں.

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے۔ ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنۂ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا؟
ہم اور تم فلک پیر جس کو کہتے ہیں فقیر غالبؔ مسکین کا ہے کہن تکیہ

یہ انداز تکرار، انداز تخاطب، اسلوب، تصوف و عرفان کا سرمایہ ہیں۔ انہوں نے جو نصب العین مقرر کیا۔ اس کے خلاف عمل نہیں کیا وہ قدیم لمحیاتہ کے شخص ہوتے ہوئے بھی جدیدیت اور نئے نئے افکار سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ انہوں نے جدید و قدیم کو کچھ یوں ہم آمیز و ہم آہنگ کیا کہ وہ فن کار بھی کہلائے اور جہانِ نو کے تلاش کنندہ بھی۔ میر دگی و پیچیدگی، دل فریبی اور دل آویزی کو امتزاجی نشان بنا کر منفرد انداز میں کچھ اس طریقے سے انہوں نے پیش کیا کہ بلوغیت زاہیت رومانیت کے شاہ کار بن کر سامنے آئے۔ مجسمہ کی تعریف یہ نہیں ہے کہ اسے گڑھ کو سرِ راہ رکھدیا جائے، بلکہ اچھے اور فنی مجسمہ کی تعریف یہ ہے کہ اس کے تخلیق کنندہ کو ہر آن یاد کیا جائے۔ اس کی غیر موجودگی کا احساس ہر کہہ و مہ کو محسوس ہو۔ مجسمہ کی تعریف در اصل مجسمہ ساز کی تعریف ہوتی ہے۔

اور نتائج کے اعتبار سے بھی تعمیری اور معیاری کہلانے کا حق دار وہی مجسمہ ہو سکتا ہے جس کی بابت عام رائے مناسب و بہتر ہو۔ اسی صورت سے اچھا سخن ور۔ تقلید پرستی اور رواج عام کے بجائے افکار تازہ سے کام لیتا ہے۔ غالب نے جس حد تک نئے نظام اور جدید ماحول سے اپنے کلام و افکار کو سنوارا اور اس کی تشکیل کی ہے وہ ایک نئے راستہ پر گامزن کرنے کا موجب ہے۔ یہی سبب ہے کہ سر سید کی آئین اکبری پر غالب نے تقریظ کے بجائے تہدید لکھی اور منفی رجحان کے بجائے مثبت رجحان کی طرف توجہ دلائی۔ یہ خیال جیا لوں کا ترجمان ہوا اور سر سید کے ذہن و خیال کو یکسر بدلنے کا موجب قرار پایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی جولانیٔ طبیعت سے ملک و قوم کو بیدار مغزی و بصیرت و عرفان سے کام کرنے کا عزم صمیم پیدا کرنے پر آمادہ کیا۔ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح میر مہدی مجروح کو آمادہ کیا کہ وہ فلسفہ، منطق اور علوم جدیدہ کی طرف رغبت کریں۔ نہ یہ کہ علم فقہ میں آگہی حاصل کریں۔ علوم جدید اور طرز جدید کے اختیار کرنے پر نہ صرف یہ بلکہ خود اپنے کو پابند کیا اور اپنے احباب ہم نواؤں سے کہا کہ اس عہد نازک میں اپنا وقت عزیز زلف و رخ اور القاب و آداب کے بجائے سادہ نگاری کی طرف صرف کریں۔ اس کے لئے انہوں نے کبھی شاعرانہ حسن کاری سے کام لیا۔ کبھی وعظ و پند اور نالۂ و پیرہن کو۔ کبھی نظم میں کبھی نثر میں۔ لیکن جب کسی شئے کا بیان کرنا مقصود ہوا تو کبھی صاف گوئی سے کہا اور کبھی استعارہ تشبیہ۔ کنایہ۔ معاملہ بندی۔ صنعت گری اور نادر اشاروں سے کام لے کر بیان کر دیا۔ لیکن کہا ضرور۔ جیسے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

انسان مختلف الخیال واقع ہوا ہے۔ غالبؔ بھی انسان تھے اور اس کے ذہنی عمل سے آگاہ۔ اس لئے اس کی مزاجی کیفیت۔ تلون امثال اور کیفیات کو کس خوبی سے اپنے ڈھب کے مطابق بیان کرے۔ اس کی خودی اور انا کو بیدار کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں۔

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے!

اس نفسیاتی اور دانفعالی تجزیہ سے ان کی فکرِ طبع کے جدید رجحانات کی نہ صرف عکاسی ہوتی ہے بلکہ ان کے متحرک اور محرک ہونے کا یقین بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ داغ سے عیب کے بجائے انسانی خاصہ مراد لیتے ہیں اور چراغ کو حقیر قرار دے کر انسانی افکار کو بلندی عطا کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔

دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ۔ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا! کارفرما جل گیا

دل کو آتش خاموش سے بچا لینا اور افکار کو چراغ و محبوب کا کلام سے تشبیہ دینا غالبؔ کی فنکاری اور فنی صلاحیت و صنعت گری کا کمال ہے۔ اور اسی کمال نے اس نثری مجموعہ کی ترتیب کی طرف راغب کیا۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ۔

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے!

"غالب نما" کے "یہ تراشے" اگر راکھ ہیں تو ان میں جستجو و تلاش سے غالب کا دل ضرور مل جائے گا۔ ورنہ ٹوٹی علامات اور ٹوٹی آبادیاں و بستیاں اور افکار و خیالات تو ضرور ہی دکھائی دے جائیں گی۔ کیونکہ ان کی یا کسی کی بھی شخصیت کے ہمہ جہت پہلو، اپنے خصوصی تاثرات اور مزاج کی گوناگوں صلاحیتوں کا علم اُس شخص سے مل کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یا اس کی اولاد معنوی۔ یعنی تحریر سے۔ تخلیق کسی بھی ادیب کا شاہکار ہوا کرتی ہے اور غالب کا تو حرف حرف ادب پارہ ہے حرف اول بھی، حرف آخر بھی۔ اس لیے۔

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر!

سید مرتضیٰ الحسین بلگرامی
مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء

مذہب غالب

اسد اللہ خاں، غالب ۸ رجب المرجب ۱۲۱۲ ہجری کو اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر تھی جو دہلی آئے اور (خاندان لوہارو سے وصل پیوند ہونے کی وجہ سے بھی) دہلی ہی کے ہو کر رہ گئے۔ یعنی تھے اکبر آبادی، مگر شاہ جہانی مشہور ہوئے۔ مرزا کو ان کے اب وجد کے عقیدے سے صرف نظر کو دیا جائے تو عقیدۃً تفضیلی اور امامیہ مسلک کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس کا ثبوت ایک دو باتوں سے نہیں۔ ان کی متعدد تحریروں اور خطوط سے ملتا ہے۔ جن میں ارادت و عقیدت کا ایک سیل بے کراں ہے۔ چند واردات قلبی ملاحظہ ہوں۔

۱۔ خدایا ان آوارگان دشت غربت کہ جمعیت جب تو عنایت کر۔ مگر تو ان کی مرتضیٰ علی کا تند رست رکھ۔ (خط بنام یوسف مرزا ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء)

۲۔ صبح کے وقت مرزا آغا جانی صاحب آئے اور فرمایا کہ حسین مرزا کی حرم لکھنؤ سے آئی تھی کہتی تھی کہ نصیب آعدا ناظر جی سخت بیمار ہیں۔ خدا خیر کرے یوسف مرزا میری جان نکل گئی۔ کیا کروں، کیوں کر خبر منگاؤں۔ یا علی یا علی یا علی۔ دس بارہ بار دل میں کہا ہوگا کہ مداری کا بیٹا دوڑا ہوا آیا اور تین خط لایا۔ (خط بنام یوسف مرزا۔ ۱۸ محرم ۱۲۷۶ھ)

۳۔ اس سال کے دو چار، حد دس گیارہ مہینے، غرض کہ انیس بیس مہینے ہر طرح بسر کر سکتے ہیں۔ اس میں رنج و راحت، دولت و عزت جو مقسوم میں ہے۔ وہ پہنچ جائے۔ پھر علی علی کہتا ہوا ملک عدم کو چلا جاؤں۔ جسم

رام پور میں، اور روح عالم نور میں۔ یا علی۔ یا علی۔ یا علی۔ (۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء وقت صبح)

۴۔ خواجہ جان جھوٹ بولتا ہے۔ والئی رام پور کو اس پینشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خداسازنہ ہے۔ یہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔ (۲۹ اپریل ۱۸۶۰ء)

۵۔ دیکھو اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح بچایا۔ بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ میرے تفقد کا حکم بھجوایا۔ حکام سے ہم کو عزت دلوائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی انہی کا بخشا ہوا تھا۔ میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا۔! (خط بنام مہدی مجروح)

۶۔ میرا دارو گیر سے بچنا معجزہ اسد الٰہی ہے۔ ان بیسیوں کا ہاتھ آنا عطیہ یداللہی ہے۔ (مئی ۱۸۶۰ء)

۷۔ خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام
یہی ہے مذہب حق والسلام والاکرام

علی علی کیا کرو اور فارغ البال رہا کرو (خط بنام مجروح مئی ۱۸۶۱ء)

۸۔ خدا کا بندہ ہوں۔ علی کا غلام۔ میرا خدا کریم، میرا خداوند سخی۔ علی دارم چہ غم دارم (خط بنام مجروح ۱۸۶۱ء)

۹۔ پروردگار بہ تصدق آئمہ اطہار بہ بیش آمد اقبال تم کو مبارک کرے اور منصب ہائے خطیر و مدارج عظیم کو پہنچاوے (خط بنام حاتم علی مہر ۱۸۵۸ء)

۱۰۔ صبر کرو اور اب ہنگامہ عشق مجازی چھوڑو۔
عشق محمد بس است و آل محمد

اللہ بس، ماسوا ہوس ۔ (خط بنام مہر)

۱۱۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت کا اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسن، ثم حسین، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام۔

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا۔ تاکہ مشرکین اور منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔ (۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء بنام علائی خان)

۱۲۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا . . . مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپیہ ظاہر کریں گے۔ (خط بنام میر مہدی مجروح۔ مئی ۱۸۶۱ء)

۱۳۔
بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

(خط بنام مہدی۔ ۱۸۵۸ء)

۱۴۔ صاحب بندہ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اس عقیدہ پر ہو (خط بنام مرزا مہر)

یہ تو تحریری نثری اور تحریری ثبوت ہیں کہ غالب کا دلی عقیدہ کیا تھا۔
اب جو لوگ ان کو صوفی صافی کہہ کر گذر جانا چاہتے ہیں' ان سے سوال ہے کہ کیا صوفی آئمہ اطہار کے سوا اصحاب و خلفا پر ایمان نہیں رکھتے؟ اگر غالب عقیدتہً ایسے تھے تو کتنے مقامات پر انھوں نے اشارۃً یا کنایتہً کچھ کہا یا لکھا ہے؟۔ حالی جو غالب کے خاص شاگردوں میں تھے۔ ان کا بیان ہے کہ۔"سنی مسلمان ہوں دو گھڑی دن رہے روزہ افطار کر لیتا ہوں۔" اس جملہ میں جو کراہیت ہے وہ اہل فقہ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اور حالی سنی المذہب تھے۔

مجلہ "شاعر، بمبئی کے۔" غالب نمبر ۱۹۶۹ء" میں جناب میکش اکبر آبادی کا ایک مضمون "مرزا غالب کا مذہب" شائع ہوا ہے۔ جس میں موصوف نے یادگار غالب یعنی حالی کے بیان پر اپنے قیاس کی بنیاد قائم کرتے ہوئے' خود حالی کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انحراف کرنے کی کوشش کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود بھی کوئی حتمی بات نہیں فرمائی کہ واقعتاً غالب کا مذہب کیا تھا؟۔ تفضیلی یا ماورائی کہہ کر گذر جانا، غیر مناسب سی بات ہو گی!۔

یہ حقیقت ہے کہ غالب نسلاً" سنی المذہب تھے مگر جس طرح دہلی کے مولانا مقبول احمد صاحب نسلاً" حنفی عالم اجل ہوتے ہوئے شیعہ ہو گئے' اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ غالب نے اپنے مطالعہ کی بنیاد پر "مذہب حقہ" اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ یہی سبب ہے کہ حالی نے غالب کے سسرالی رشتہ داروں کے اس فعل کو ناپسند کیا تھا، جس کا اظہار تفضیل کے ساتھ "یادگار

غالب" میں موجود ہے۔ خود غالب حضرت علی کو خلیفہ بلا فصل تک ماننے کے روادار نہیں تھے، کیونکہ ان کے نزدیک ...۔" علی کو امام سمجھتا ہوں اور دوسروں کو خلیفہ"۔ یہ جملہ "دوسروں کو" قابل غور ہے۔ اسی پر اکتفا کر لی ہوتی تو خیر تھی۔ مرزا صاحب آگے چل کر بحث کو ایک نیا موڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"... خلافت، سلطنت اور ریاست کے ہم معنی ہیں۔ عرب کی زبان میں رئیس اور حاکم کو خلیفہ کہتے ہیں۔ اگرچہ خلافت کے لغوی معنی نیابت کے ہیں۔ غرض یہ کہ علیؑ نبیؐ کے بعد بلا فصل امام ہیں (خلیفہ نہیں) امامت خدا کی طرف سے ہے، اور علیؑ امام ہیں، ابو بکر کی خلافت کے زمانے میں بھی، عمر کی خلافت کے زمانے میں بھی، عثمان کی خلافت کے زمانے میں بھی"

یہاں تک جمہور اسلام کی حد تک انہوں نے وہی کہا جو سب کہتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد تو غالی "شیعہ" مسلک کا پیرو ہونے والے شخص کا تصور پیش کر کے اپنے کو جمہور سے جدا کر لیتے ہیں۔۔

ملاحظہ ہوں یہ سطریں ـــ

"... اور یہ جو مشہور ہے کہ عثمان کے بعد علیؑ خلیفہ ہوئے غلط ہے۔۔

اصل بات یہ ہے کہ امام برحق علیؑ مرتضیٰ، حبیب رسولؐ کے بعد امام ہوئے، تو انہوں نے ابو بکر صدیق کو خلیفہ کر کے، حکومت کا کام ان کے سپرد کر دیا، تاکہ مسلمان خطروں سے محفوظ رہیں اور آپ مسلمانوں پر فرمان روائی کریں"۔

لیکن غالب نے بات یہیں پر ختم نہیں کر دی۔ آگے تحریر کرتے ہیں کہ ـ

"... اس کے بعد عمر کو پسند کیا اور ان کے بعد عثمان کو خلافت دی۔ ان تینوں نے اپنے کو "سپرد" کر دیا اور نبی اور امامؑ کی اطاعت کی۔ عثمان کے بعد کوئی شخص حکومت کے قابل مسلمانوں میں نظر نہ آیا۔ جس شخص نے اس کی آرزو کی" وہ بھی اس کا اہل نہ تھا، مجبوراً امام وقت نے، حکومت کا کام بھی خود ہی سنبھال لیا اور اہل اسلام کے جھگڑوں کو طے کرنے لگے ... بادشاہ اگر قاضی کا کام کرنے لگے تو اسے قاضی نہیں کہیں گے"۔ (مکتوب بنام غمگین دہلوی)

اس خط کے بعض جملے بے حد خطرناک اور غور طلب ہیں۔ مثلاً اسی عبارت کے یہ جملے ۔

۱۔ مجبوراً امام وقت نے حکومت کا کام

۲۔ بادشاہ اگر قاضی کا کام کرنے لگے

یا اس سے اوپر والے پیراگراف کے یہ جملے ۔

۱۔ .. عثمان کے بعد علی خلیفہ ہوئے" غلط ہے۔

۲۔ .. جب رسول کے بعد امام ہوئے تو انہوں نے ابوبکر صدیق کو خلیفہ کر کے حکومت کا کام۔

مطلب یہ کہ حضرات ابوبکر یا عمر کو انہوں نے " حکومت " سونپی۔ کیوں کہ علیؓ امام وقت تھے اور امام " من اللہ " ہوتا ہے۔ اس لئے گویا حضرت علی کو حق حاصل تھا کہ وہ ان تینوں حضرات سے امت کا کام لیتے۔ اسی طرح حالی کا بیان ہے۔

" انہوں نے تمام عبادات وفرائض وواجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحید وجودی اور دوسرے نبیؐ و اہل بیت

نبی کی محبت - اور اسی کو وسیلۂ نجات سمجھتے تھے"۔ (یادگار غالب۔ ص ۶۲)
یہ مسلک اور عقیدہ خالص "تفضیلی" کا ہے۔ اس لئے کہ جو بھی اس مسلک کا ماننے والا ہوگا یعنی خلفا کو حق "خلیفہ" تصور کرے اور حکومت کا کام چلانے والا اور حضرت علی کو خلیفہ بھی تسلیم نہ کرے بلکہ خالص امام۔ اس کا مذہبی عقیدہ - سب کچھ ہو سکتا ہے۔ سنی - نہیں۔ میرا مدعا صرف اس قدر ہے کہ علی کے غلام کو۔ اس کے عقیدے کو، اس کی نیت کو اس کی نیت ہی کے آئینہ میں دیکھنا چاہیئے۔ غالب کا شعر ہے۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مصروف حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

یا یہ شعر ملاحظ ہوں

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

ایک ہی ردیف و قافیے کے دونوں شعر ہیں۔ لیکن اس شعر کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "ساقی کوثر" سے مراد رسول مقبولؐ ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت علی مراد ہیں۔ غرض یہ کہ یہ شعر ہو یا وہ۔ نبیؐ اور علیؑ کے ورد سے ان کی زبان تھکتی نہیں ہے۔ اور لطف یہ کہ وہ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے اگر مذہب و ایمان کی بات کریں اور سنی و شیعہ کا لحاظ نہ رکھیں تو کسی حد تک خیال نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں —

"سنو صاحب ۔ لفظ مبارک میم" حا" میم" دال (یعنی محمدؐ)
اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے"۔ (۱۷ ستمبر ۱۸۵۷ء)

مرزا تفتہ کو مرزا غالب نے اپنے ایمان سے خبردار کر دیا اور اس میں عار نہ سمجھا۔ اسی طرح الہیٰ خاں کے نام جو خط روانہ کیے اس میں صراحت سے اپنے "ایمان" کا اظہار کر دیا ہے۔ اور مسئلہ کے اس رخ پر وضاحت سے بیان دیا ہے کہ۔

"... امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسن۔ ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام"۔

جب کہ اہل سنت کا ایک بڑا طبقہ۔ " مہدی "۔تک کے سلسلے کو نہیں مانتا۔ لیکن شیعی عقائد کی بنیاد اس بات کے تسلیم کرتے پر منحصر ہے یا غمگین دہلوی کو جو خط بزبان فارسی ارسال کیا تھا جس کا نثر ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں " وہ دل کی آواز معلوم ہوتے ہیں

اس بحث سے میرا ہرگز یہ مدعا نہیں کہ غالب کو شیعہ ہونا چاہیے تھا۔ یا کہ وہ شیعہ ہیں۔ مقصد صرف اس قدر ہے کہ غالب صدی میں جہاں ان کے حرف حرف ۔ کلمہ کلمہ پر تحقیق کی جاری ہے۔ جہاں ان کے خطوط کو تاریخ وار سنین کی حدود میں مرتب کیا جا رہا ہے۔ جہاں ان کے کلام کو ترتیب نو سے نوازا جا رہا ہے ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ان کے "عقیدے" سے متعلق قطعی فیصلہ کر لیا جائے لغائدے سے قطع نظر ۔ اس طرح ان کے وجود وجوب اور لا الہ الا اللہ ۔ لا معبود الا اللہ ۔ لا شریک الا اللہ کے

عقیدے پر قطعی حکم لگایا جا سکتا ہے۔ ورنہ غالب زرتشت، آتش پرست زندقہ اور مجوس کے فرقا سے آگاہ تھے۔ اسی طرح اللہ اور اس کی عنایات پر بھی عقیدہ رکھتے تھے۔ قیامت پر بھی ایمان کامل رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ رسول اور آل رسول کے فدائی تھے۔ دوزخ کی آگ اور جنت کی ہوا کے احساس سے بھی آشنائی رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس لئے سوال ہے کہ ان کا "مذہب" کیا ہے؟۔ کیونکہ وہ شراب پیتے بھی نظر آتے ہیں اور اس کو فعل قبیح بھی قرار دیتے ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند کیا قائل ہی نظر نہیں آتے، لیکن فقہی مسائل پر اتنی گہری نظر رکھتے ہیں کہ باید و شاید۔ چنانچہ میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو۔ جو لائی ۱۸۵۷ء سے قبل ایک خط میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔ آج تک سنا نہیں کہ رب کبریا کسی نے لکھا ہو؟۔ ہاں "کبریا الٰہی" یعنی خدا کی بزرگی۔ اس نظریہ "رب کبیر" لکھیں گے، نہ کہ "رب کبریا"۔ کبریا۔ صفت واقعی ہے لیکن اگر صفت سے موصوف مراد رکھیں۔ تو ممکن ہے جیسا کہ "زید عدل" بجائے "زید عادل"۔ جناب کبریا۔ بجائے جناب الٰہی جائز ہے۔"

یہاں تک تو "رب کبریا" پر لغوی بحث تھی۔ اس میں ہر گوپال تفتہ اور مہدی مجروح کی کوئی قید نہیں۔ لیکن اس عبارت کے بعد جو عبارت آتی ہے۔ وہ غالب کے عقیدے سے متعلق ہے۔

"ایک نکتہ دقیق ہے یعنی "مذہب حقہ امامیہ" میں مجموع صفات عین ذات ہے۔ پس اگر ہم نے خدا کو محض قدرت یا اگر محض عظمت کہا تو موافق ہدایت نبی اور آئمہ کے ہمارا قول درست ہے"۔

قول و فعل کے اس تضاد کے باوجود وہ اپنے فعل پہ نادم اور اپنے

قول پہ نازاں نظر آتے ہیں۔ بقول الٰہی بخش خان، معروف۔

:نگیں دل سوا لکھو دے تو گر غلام ہو جائے:

اور غالب نے گھر کی غلامی کبھی گوارہ نہیں کی۔ ان کا جسم دنیاوی آلائشوں سے مبرا نہ تھا مگر ان کا دل طائر تھا حب رسول سے معمور۔ زبان کچھ کہتی رہی مگر عقیدۃً وہ آلِ رسول کے فدائی تھے۔ آمرزو عفو کے طلب گار۔ شفاعت و نبوت رسول کے لئے اور امامت آئمہ کے لئے من اللہ جانتے تھے۔

اس لئے غالب کا یہی دین و ایمان اور یہی عقیدہ بھی ہوتا چاہیئے۔ یہ خیال اغلب ہے۔ مگر فیصلہ اہل انصاف پر منحصر ہے۔ ورنہ غالب نے عقیدۃً جو شعر کہا تھا وہ حرف آخر ہے۔

ہم شبیر سے تو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفت دلدل میں یہ سرگرمی شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

سب سے آخر میں یہ شعر پیش کرتا ہوں اور رخصت چاہتا ہوں۔

حرف اعدا اثر شعلۂ دودِ دوزخ
وصف احباب گل و سنبل فردوس بریں

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تاریخا

حضرت سید صاحب عالم، صاحب بلگرامی ثم مارہروی نے غالب کو ایک خط میں لکھا کہ :۔

:میرا سال پیدائش لفظ تاریخ میں مضمر ہے:

اس کا جواب غالب نے بصورت شعر یہ ارسال کیا :

ہاتف غیب شب کو یوں پہنچا ۔
ان کی تاریخ ، میرا تاریخا ۔

۱۲۱۱ھ ۱۲۱۲ھ

اس تاریخ میں اضافی حرف (الف) سے غالب نے جو فائدہ اٹھایا اور تاریخ نگاری کا کمال ظاہر کیا ہے، وہ داد کا مستحق ہے

حضرت صاحب عالمؒ مارہروی نے ۱۲۸۸ھ میں وفات پائی اور جدی شاہ سید برکت اللہ صاحب اعلی اللہ مقامہ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مرحوم و مغفور صاحب تذکرہ جلوہ خضر شاگرد غالب دہلوی، ان ہی صاحب عالمؒ کے نواسے تھے۔ نیز شاہ سید علی احسن مارہروی شاگرد داغ دہلوی بھی اسی خانوادے کے بزرگ تھے۔ ملشورات، انشائے داغ، مکاتیب غالب آپ کی خاص تصانیف ہیں۔

صحت یا مرگ

حضرت شاہ عالم صاحب مارہروی کے لئے، چودھری عبدالغفور سرور، مارہروی کے ایک خط میں غالب ان کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"شاہ عالم صاحب اس خط کی پشت پر لکھتے ہیں کہ تو نے میرے خط کا جواب نہیں لکھا۔ حالانکہ میں ان سطروں میں لکھ چکا ہوں کہ نہ مجھے تحریر کی طاقت، نہ اصلاح کا ہوش۔ ایک بات کو دس دس بار کیا لکھوں؟ اب انجام کار دو طرح پر مقصود ہے۔ صحت یا مرگ۔ پہلی صورت میں خود اطلاع دوں گا، دوسری صورت میں سب احباب خارج سے سن لیں گے۔ یہ سطریں لیٹے لیٹے لکھی ہیں۔"

غالب کو اپنی موت کی بے حد آرزو تھی۔ وہ آخر عمر کا ہر لمحہ اسی آرزو میں گذار رہے تھے ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۹ء تک کے کئی خطوں میں۔ انہوں نے اس امر کی طرف نشان دہی کی ہے۔ قطعہ تاریخ مرگ اور اعلان سال مرگ تک کیا۔ مگر کچھ وبا عام کی وجہ سے زندگی کو موت پہ ترجیح رہی اور کچھ کسی اور وجہ واقعی کے سبب۔

غالب مغلوب

بے ساختگی اور طرز ادا، پسندیدگی و ناپسندیدگی، کیفیت حالت و جذبہ سب کچھ ان جملوں میں پوشیدہ ہے۔

"حضرت صاحب قبلہ و کعبہ جناب صاحب عالم کو فقیر اسد اللہ کی بندگی دیباچہ کا عظیم آباد کو روانہ ہونا معلوم ہوا کہ لخت جگر لو نظر سید فرزند احمد (صفیر بلگرامی) کو وہ دیباچہ پسند آیا یا نہیں۔ ہائے دستشہ دار آنکھیں ضعف البصر۔ حواس مسلوب۔ "فی جملہ مختصر من کل الوجوہ غالب مغلوب ہیں ..."

غالب نے یہ خط ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء کو روانہ کیا تھا۔ اس خط کے آخر میں تاریخ و سنہ کے بعد نام کی جگہ صرف "اسد" لکھا ہے۔ دیباچہ سے مراد صفیر بلگرامی کی کتاب رسالہ تذکرہ تانیث کا دیباچہ ہے۔ صفیر بلگرامی حضرت صاحب عالم کے حقیقی نواسے تھے۔ اور بلند پایہ ادیب، صحافی شاعر اور ناقد۔ علوم مشرقیہ پر کامل نگاہ تھی۔ راقم کو ان سے وہی نسبت ہے، جو ان کو حضرت صاحب عالم سے تھی۔

آغاز نامہ

غالب کے ہم عصروں میں حضرت صاحب عالم صاحب بلگرامی ثم مارہروی کا درجہ بہت بلند تھا۔ دونوں نسبت ادبی رکھتے تھے۔ کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکے مگر خط و کتابت میں اشتیاقِ دید وارفتگی کی حد تک موجود ہے۔ ایک تحریر کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"... آج دوپہر کو میر عبدالعزیز صاحب آئے۔ میرا بے کلام در پیرہن پلنگ پہ لیٹا ہوا تھا۔ ان کو دیکھ کر اٹھا، مصافحہ کیا۔ انہوں نے جناب شاہ عالم صاحب کا خط مع مسودات اشعار دیا اور فرمایا کہ پھر دوں جاؤں گا۔ عرض کیا کہ کل آخر دن آپ تشریف لائیں۔" ... جواب

اور اصلاحی مسودہ لے جائیں۔ وہ تشریف لے گئے۔ میں لیٹ رہا۔ دن کو سونے کی عادت نہیں ہے۔ جی میں کہا آؤ بے کار کیوں رہو۔ خط کا جواب آج لکھ رکھو۔ اُٹھے کون ؟ بکس کھولے کون ؟ لڑکوں کی دوات قلم مونڈھے پر پلنگ کے پاس رکھا۔ خطاب مقتضی اس کا ہوا کہ آغاز نامہ بنام اقدس ہو۔ انداز تخاطب ملاحظہ ہو۔ خط بیٹے کا مگر جواب باپ کے نام لکھا جا رہا ہے۔ لفظ "اقدس" میں جو تقدیس پنہاں ہے، اس کی تشریح کون کر سکتا ہے

تیر نشتر

غالب نے نثر و نظم میں جو روش اختیار کی اور تنقیدی رجحانات کو جس طرح مدنظر رکھ کر اپنے احباب کو آگاہ کیا۔ وہ ان کا وصف کمال ہے۔ میر۔ سودا۔ قائم اور مومن خاں کے اشعار کو اپنے استدلال کے طور پر پیش کرتے ہوئے۔ سرور مارہروی کو لکھتے ہیں۔

میر تقی علیہ الرحمتہ :
بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا ,,
دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم ,,
قائم اور تجھ سے طلب بوسہ کی ؟ کیونکر مانوں
ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بد آموز نہیں،

مومن ,,
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے ہاں کم تر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں۔ مگر ان کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا۔ یاد کیا اُو سے۔ بیٹھا ہوا ہوں۔ دم بدم پاؤں کے ورم کی ٹیس ہوش اڑائے دیتی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۱۸۶۳ء)

حقیقت یہ ہے کہ غالب کا تنقیدی شعور بے حد پختہ اور رچا ہوا تھا۔ فکری بلوغت بے حد و حساب تھی۔ چنانچہ ان کے پیش کردہ اشعار ان کے استدلال کی جان ہیں۔

مجھ پہ رونے والا

حیرت ہے کہ غالب کو اپنی زندگی اور اپنے جان اور مال پہ غور کرنے کا کتنا عمدہ سلیقہ ہاتھ آیا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے جرم میں حکیم احسن اللہ خاں بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ ان کی رہائی کی خبر پا کر غلام نجف خاں کے نام ایک خط میں اپنے تاثر کو یوں ظاہر کرتے ہیں۔

:۔ جناب حکیم صاحب ایک روز از راہ عنایت یہاں آئے کیا کہوں کہ ان کی دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے۔ خدا ان کو زندہ رکھے خصوصاً اس فتنہ آشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہوگا اس راہ سے مجھ کو جو دوست اب باقی ہیں۔ بہت عزیز ہیں۔ واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں، کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پہ رونے والا بھی تو دنیا میں ہو ؟ :

کتنی حسین آرزو ہے۔ جذباتی، واقعی اور فکر انگیز۔ ویسے

رہم ہیں سے کون ایسا ہو گا جس کو پرآشوب حالات میں ایسی تمنا کا احساس نہ پیدا ہوا اور غالب تو واقعتاً تمنائی تھے۔ روئے محبوب کے بھی تمنائی تھے اور آرزوئے مرگ کے بھی۔

تاہل میری موت ہے

غالب نے اپنی زندگی کی پریشانی کو کئی اشخاص کے خطوط میں تاہل اور زنجیر پا کو سبب فکر قرار دیا ہے۔ اس خط میں اپنے اس تصور کو پھر دہرایا ہے:

بھائی میرا ادب سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے ایک کو تنہائی سے نفور ہے۔ ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دولت تنہائی میسر آجاتی۔ لیکن اس تنہائی چند روزہ اور تجرید مستعار کی کیا خوشی؟ خدا نے لاولد رکھا تھا شکر بجا لاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے۔ یعنی جس لوہے کا طوق، اسی لوہے کی دو ہتکڑیاں بھی پڑ گئیں۔ خیر اس کا رونا کیا ہے؟ یہ قید جاودانی ہے؟۔

(خط بنام غلام نجف خاں۔ ۱۔ اپریل ۱۸۵۸ء)

کیا خوب انداز تحریر ہے۔ بیگم کو طوق اور زین العابدین خاں عارف کے دو بچوں کو جو بیگم غالب کے قرابت داروں میں تھے، ہتکڑیاں قرار دیتے ہیں اور عارف بماحت لکھتے ہیں "اسی لوہے کی"۔ اس جملہ میں جو حقیقت اور طنز ہے اس کے خیال سے ہی کتنا لطف آتا ہے۔

ہوش میں آؤ

حکیم غلام نجف خاں کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

: بھائی۔ ہوش میں آؤ۔ میں نے تم کو خط کب بھیجا؟ اور رقعہ میں کب لکھا کہ شبیر زماں کا خط تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میں نے تو ایک لطیفہ لکھا تھا کہ شبیر زماں خاں نے میرے خط میں بندگی لکھی تھی۔ اور میں وہ بندگی اس رقعہ میں لپیٹ کر تم کو بھیجتا ہوں۔ بس بات اتنی ہی تھی۔ وہ بندگی لکھی ہوئی گویا تیتی ہوئی تھی، سو حضرت کو پہنچ گئی۔ خاطر عاطر جمع رہے:۔

ایک معمولی سی بات کو غالب کی طرز ادا اور انداز جدید نے کیا رخ اختیار دیدیا ہے۔ کہ جس کے نام خط لکھا گیا وہ خود حیرتی بن گیا۔

نئے اور پرانے چاول

معمولی سی باتیں بھی غالب کے دائرہ قلم میں آکر اہم ہو جاتی ہیں۔ ان کا درجہ بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً ایک خط کی ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں:۔

:۔ میاں، چاول بڑے۔ بڑھتے نہیں۔ لمبے نہیں۔ پتلے نہیں، اب زیادہ قصہ نہ کرو۔ پرانے اور پتلے چاول آئیں۔ ایک روپے کے خرید کر کے بھیج دو۔ یاد رہے نئے چاول قابض ہوتے ہیں اور پرانے چاول قابض نہیں ہوتے۔ یہ میرا تجربہ ہے"۔

یہ خط حکیم غلام نجف خاں جو حکیم احسن اللہ خاں کے نرات داروں میں تھے، اُن کے نام لکھا گیا ہے۔ انداز ادا اور طریقہ تحریر

کی خوبی کے سوا چاول کی اچھی قسم یا صفت خاص کیا ہونی چاہیئے؟ نئے اور پرانے چاول کی کیا خاصیت ہے؟ ان امور کا چند سطروں سے علم ہو جاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود غالبؔ کو کس قسم کے چاول پسند تھے اس تحریر سے یہ واقفیت بھی ہوتی ہے

مفرحِ روح

: حضرت سید عالم کو نیاز، خورشید عالم کو سلام چودھری صاحب کو نہ سلام، نہ نیاز۔ صرف یہ پیام کہ ہم تمہارے خط کو مفرحِ روح سمجھتے تھے۔ باتوں کا مزہ ملتا تھا، خیر و عافیت معلوم ہو جاتی تھی۔ وہ وظیفہ روحانی منقطع کیوں ہوا؟ صاحب یہ روش اچھی نہیں۔ گاہ گاہ رسل و رسائل کا طور رہنا رہے"

شکوہ، شکایت کا نرالا انداز اختیار کیا ہے۔ اصل خط حضرت صاحب عالم صاحب کے نام ہے۔ یہ آخری سطور چودھری عبدالغفور، سرور مارہروی کے لئے تحریر کی گئی ہیں۔ فہمائش بھی ہے، فرمائش بھی۔

بس غارت ہو گیا

غالبؔ کو مرزا تفتہ (ہرگوپال) سے جو انسیت اور محبت تھی وہ ان کے خطوط سے آشکارا ہے۔ "دستنبو" کی طباعت کے سلسلے میں مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

: صاحب مطبع نے خط کے لفافہ پر لکھا ہے "مرزا نوشہ صاحب" للہ غور کرو کہ یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحہ اول کتاب

پر بھی نہ لکھ دیں ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے بھی ان کو میرا نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی نفرت عرف سے، وجہ اس واویلا کی نہیں ہے۔ بلکہ سبب یہ ہے کہ دلی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے۔ لیکن کلکتہ سے ولایت تک، یعنی وزراء کے محکمہ میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ پس اگر صاحب مطبع نے "مرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا، کھویا گیا۔ مری محنت رائگاں گئی۔ گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی۔ ۔ (یکم ستمبر ۱۸۵۸ء۔ بدھ کا دن)

یہ خلش، یہ خطرہ اور دوراندیش کی سرحدوں کو کہاں کہاں چھو رہی ہے۔ یہ احساس ہی تھا جس نے غالب کو زندگی بھر بے دار اور بیزار رکھا۔

داغ اولاد

انسان کی سرشت میں اولاد سے محبت یا اس کی تمنا داخل ہے غالب بھی "ہزار درجہ انکار کے باوجود اولاد کے تمنائی تھے۔ سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

"تمہارے لڑکا پیدا ہونا اور اس کا مرجانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ ۷۴ برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر بھی پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی ۔ خطوط غالب

ممکن ہے اولاد کی اسی چاہ نے غالب کو شراب نوشی اور چوسر بازی کی طرف متوجہ کیا ہو۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ یہی داغ

اولاد تھا۔ جس نے بیگم غالب کی بہن بنیادی بیگم کے لڑکے زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنانے پہ مجبور کیا۔ اگرچہ ان کا یہ تمنائی بھی عین عالم جوانی میں غالب کو داغ مفارقت دے گیا۔ اور غالب نے دردناک مرثیہ کہا۔ مشہور عالم شعر یہ ہے۔

جلتے ہوئے گئے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور؟

نیک نخت

اردو خطوط میں غالب نے عبارت آرائی کو ہی نیا آہنگ نہیں بخشا تھا بلکہ وہ فرسودہ افکار کو بھی ایسے حسین پیرایے میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جس سے نہ صرف وہ عہد خالی تھا۔ بلکہ آج بھی اس ہنر میں کوئی یکتا نظر نہیں آتا۔ ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ ۶۵ برس کی عمر ہے۔ ۵۰ برس عالم رنگ وبو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق وفجور نہیں پیو کھاؤ۔ مزے اڑاؤ۔ مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت

جاودانی ہے۔ اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمرّدین کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

(خط بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر)

اس خط میں غالب نے حسن فلسفہ سے کام لیا ہے۔ اس کے پس منظر کو دیکھا جائے تو لطف و انبساط سوا ہو جاتا ہے یعنی مہر کی ایک محبوبہ کی تیرگی عاقبت سے متاثر ہو کر غالب نے جو انداز تحریر اختیار کیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب موت کو برحق مانتے ہوئے بھی صرف زندگی کی رنگ رلیوں کو اصل حیات خیال کرتے تھے۔ حالانکہ ایسا نہ تھا۔ بلکہ واقعات حادثات اور شخصیت کے مطابق ان کا قلم اٹھتا تھا۔ ایک دوست دوسرے دوست کی محبوبہ پر صبر و ضبط کی تلقین کے سوا اور کیا لکھ سکتا ہے! اس کا طریقہ خاص غالب سے سیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح چند لمحہ کے لیے مہر کے غم و فکر کو کس خفیف انگیز مقصود سے کم کرنے کا طریقہ انہوں نے ایجاد کیا۔ اس ایجاز کے باب میں خود کہتے ہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غالب بھی ہے

مراسلہ کو مکالمہ بنا دینا غالب کی ایجاد ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

: جناب چودھری صاحب۔ آؤ ہم تم حضرت عالم کے پاس چلیں۔ اور اپنی آنکھیں ان کے کف پائے مبارک سے ملیں۔ میں سلام عرض کروں گا۔ تم معروض ہونا کہ غالب بھی ہے۔ اہل دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب ہی ہے۔ میں نے عزم قدم بوسی کیا۔ پیرو مرشد نے مجھے گلے لگایا۔

فرماتے ہیں کہ :۔ غالب تو اچھا ہے ؟ :۔

عرض کرتا ہوں :۔ الحمد اللہ حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے ؟

ارشاد ہوا کہ :۔ مولوی سید برکات حسن تیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔

غالب :۔ جناب یہ ان کی خوبیاں ہیں۔ میں ایسا نہیں ہوں۔ جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری بےخودی کا حال لکھتے۔ ضعف وقویٰ کا تحمل لکھتے۔ تاکہ میں ان کے کلام کی تصدیق کرتا۔ ان کی غمخواری اور دردمندی کا دم بھرتا۔ ۱

یہ خط چودھری عبدالغفور سرور کے نام ہے۔ لیکن مضمون حضرت عالم صاحب مارہروی سے متعلق ہے۔

ستیاناس جائے

غالب کو زبان پر جو قدرت حاصل تھی، اس کا اعجاز دیکھئے کہ بے ساختہ ایسے الفاظ استعمال کر گئے ہیں۔ کہ پڑھنے والا اسے خود استعمال کرنا چاہے۔ تو ازحد دشواری ہو۔

۱۔ وہ میاں ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے/ جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ " بے مراد" صحیح اور " نامراد" غلط۔ ارے ستیاناس جائے " بےمراد" اور " نامراد" میں وہی فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے " نامراد" وہ ہے کہ جس کی کوئی مراد کوئی خواہش، کوئی آرزو بر نہ آوے۔ " بے مراد" وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوش مدعاسے زیادہ ہو۔ ازقسم بے مدعا و بے غرض و بے مطلب . . .

یہ خط حضرت صاحب عالم صاحب مارہروی کے نام غالباً ۱۸۶۵ء میں تحریر کیا گیا ہے۔ ہم معنی الفاظ کی کیا نادر طریقہ سے تعریف کی ہے۔ کہ معمولی سا ذہن رکھنے والا شخص بھی قائل ہو جائے۔

دیا ہے پھونکیں

حضرت سید صاحب عالم بلگرامی ثم مارہروی، تخلص عالم سے غالب کو جو ارادت و عقیدت تھی، وہ ان کے خطوط سے ظاہر ہے۔ چودھری عبدالغفور، سرور مارہروی کو حضرت صاحب عالم کی ایک تحریر سے متعلق لکھتے ہیں :۔

: سیاہی پھیکی، کاغذ پتلا، پیرو مرشد کی عبارت ایک طرف

آپ کی تحریر بھی مغشوش ہو گئی۔ بہرا ہو گیا ہوں مگر علت بعر ہنوز باقی ہے ..... حضرت کی تحریر کا ایک لفظ، سوائے سعادت توام شاہ عالم کے اگر پڑھا گیا ہو تو دیدے پھوٹیں۔ ایمان نصیب نہ ہو!"

حقیقت یہ ہے کہ حضرت صاحب عالم صاحب، بے حد بدخط تھے خط شکستہ اور بے نقط لکھا کرتے تھے اگرچہ بڑے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ قابل۔ لائق، فائق اور علوم متداولہ پر نظر غائر تھی۔

تم بھی رہو

غالب کے خاص تعلقات والوں میں ایک عالی خاندان امیر محمد نصیر مرشد آبادی کے لڑکے یوسف مرزا بھی تھے۔ جن کا انتقال ۱۲۸۳ھ میں لکھنؤ میں وفات غالب سے ۲ سال قبل ہوا تھا۔ ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں ایک بیوی۔ دو بچے۔ تین چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان۔ ایاز یہ باہر، مداری کے جورو بچے بدستور گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود ..... (۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء) وقت صبح

اس تحریر سے مرزا غالب کی وسعت قلب اور نرم دلی کا اظہار ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ پہلے زمانے کے لوگ کسی کی مصیبت دیکھنا گوارا ہی نہ کرتے تھے۔ خود پریشانی میں مبتلا رہنا گوارا کر لیتے، لیکن اپنے متوسلین و متعلقین کا ہراساں رہنا ان کو منظور نہیں تھا۔

قدِ آدم دیوار

غالبؔ کو زبان اور محاورہ پر جو عبور حاصل تھا، اس کی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے انوار الدولہ نواب سعد اللہ خاں تخلص شفقؔ رئیس کدورا۔ کالپی کے نام ایک خط میں اپنی موت سے ٹھیک ۸ سال قبل اپنی حالت و کیفیت کے سلسلے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

:..... سال گذشتہ مجھ پر بہت سخت گذرا۔ بارہ تیرہ مہینے صاحب فراش رہا۔ اٹھنا دشوار تھا۔ چلنا پھرنا کیسا؟ نہ تپ، نہ کھانسی نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ۔ ان سب سے بدتر ایک صورت ہرگذورت۔ یعنی احتراقِ خون کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے۔ ہر پھوڑا ایک زخم، ہر زخم ایک غار، ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھائے اور پھاؤ بھر مرہم درکار۔ تو دس مہینے بے خور و خواب رہا ہوں اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یوں گذری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی، دو گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی جاگ اٹھا، تڑپا کیا، پھر سو گیا پھر ہوشیار ہو گیا۔ سال بھر میں سے تین حصے دن یوں گذرے۔ پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سرے سے روح قالب میں آئی، اجل لے۔ میری سخت جانی کی قسم کھالی۔ اب اگرچہ تندرست ہوں، لیکن ناتوان و سست ہوں، حواس کھو بیٹھا۔ حافظہ رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قد آدم دیوار اُٹھے۔"

یہ محض شاعری نہیں۔ بڑھاپے کی تصویر ہے۔

حالی نے سنایا

یادگارِ غالب کی عظمت و عزت اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس کی تصنیف حالی کی ذہنی محنت ہے بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ حالی نے جو کچھ دیکھا یا سنا بلا مبالغہ، بے کم و کاست پیش کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ یادگارِ غالب کو ایک مقدس امانت سمجھا جاتا ہے۔ اور آج تک حالی کے بیان کردہ کسی واقعہ سے اختلاف نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس سلسلے میں عہدِ غالب کے تین مشاہیر کی رائے حالی نے اپنی تصنیف میں اس طرح پیش کی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

نواب مصطفےٰ خاں، شیفتہ :۔ ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب کلیم سے مراتب برتر و بالا سمجھتے تھے۔

سید غلام علی، وحشت :۔ مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیہ کی طرف متوجہ ہوتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبی یا ابوتمام ہوتا اور انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

نواب ضیا الدین احمد خاں، نیر :۔ کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (امیر خسرو) سے ہوئی اور ایک ترک ایبک (غالب) پر اس کا خاتمہ ہو گیا

ان آرا میں نہ کل شبہ تھا۔ نہ آج۔ غالب اپنے عہد کے فارسی و عربی کے فاضل اجل اور منطق و فلسفہ کے ماہر یگانہ تھے۔ قدیم فارسی کے حقائق پر ان کی پوری نگاہ تھی۔ دستنبو، مہر نیمروز، اور دیگر رسائل و کتب اس کے شاہد ہیں۔

سخت غلطی

حالی نے یادگارِ غالب میں غالب اور مولانا فضل حق کے سلسلہ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ کسی شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا سے دریافت کیے۔ غالب نے اپنے فہم کے مطابق اس کے معنی بیان کر دیے مگر اس شخص کو اس سے اختلاف ہوا اور اس نے مولانا فضل حق سے کہا کہ مرزا نے اس شعر کے غلط معنی بیان کیے ہیں۔ اور ناصر علی سرہندی کا ہرگز یہ مدعا نہیں ہوگا۔ مولانا فضل حق نے برجستہ کہا۔

" اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو مرزا نے سمجھے ہیں۔ تو اس نے سخت غلطی کی ہے۔"

اس جواب سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غالب کے عہد میں ہی مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے فاضل و عالم حضرات بھی ان کی ادبی سوجھ بوجھ سے کس قدر متاثر تھے۔

مبالغہ نہیں

یادگارِ غالب میں مولانا حالی نے مرزا غالب کی شاعری اور پختہ کاری کے ضمن میں یہ لکھا ہے۔ کہ مرزا نے ایک شعر میں اپنے آپ کو شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا، کسی نے مومن خاں کو مرزا کا یہ شعر سنایا۔

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب
گر ترقی نہ کنم شیخ علی درمانی

تو مومن خاں نے بلا تامل کہا۔

"اس میں مبالغہ نہیں ہے۔ مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔"

اس واقعہ میں جہاں مرزا غالب کی برتری کا احساس ہوتا ہے وہیں مرزا کے ہم عصروں کی عالی ہمتی اور قدردانی کا علم بھی ہوتا ہے۔ ورنہ کون کس کی قدر کرتا ہے۔ اور اپنے احباب سے کون کس کی عظمت کا اعتراف کر کے اپنی وقعت میں کمی کا موجب بننا گوارہ کرتا ہے! یہ مومن کی بزرگی اور بڑائی کی دلیل ہے کہ انہوں نے تعلی کو بھی قدر کا درجہ بخشا۔

مقصود شاعر

غالب کا شعر ہے۔

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے

اس شعر کی تشریح خود ہندی میں غالب نے اس طرح کی ہے۔

"— داغ سامان، مثل انجمن۔ وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ وساماں ہو۔ موجودیت لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے۔ ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھیے کہ پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے، دہقان کو جوتنے، بونے، پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج وعناد ہے۔ مزارع کا لہو جو کشت وکار میں گرم ہوا ہے وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت اور داغ نما لفراحت اور صورت رنگ غنچہ۔"

غالب کا فکری عنصر کس قدر بلیغ اور انفع تھا۔ ان کی اس شرح سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز یہ کہ غالب اپنے افکار اور سوجھ بوجھ کو الفاظ کے گھروندے میں مقید کرنے سے قبل ان کا فہم و ادراک رکھتے تھے۔

شاعر کے دو مصرعے

غالب۔ ان کا عہد۔ ان کی حالت و اصلیت جس طرح ان کی تحریروں کے ذریعہ ہمارے سامنے آئینہ ہو کر آتی ہے۔ اردو کے کسی دوسرے شاعر (سوا میر کے) نہیں آ سکی۔ غالب پر ایام غدر ۱۸۵۷ء کے ایک جاسوس گوری شنکر نے انگریزوں کو خفیہ اطلاع دی کہ ۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو جب بہادر شاہ نے دربار کیا تو مرزا غالب نے یہ سکہ کہہ کر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

بزر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

غالب نے اپنے کو اس الزام سے بری ثابت کرنے کی بہت کوشش کی مگر سب بے سود ہوا۔ الزام ثابت نہ ہونے کے باوجود مشکوک رہے اس بات کا ذکر ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں۔

"میں نے سکہ نہیں کہا اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں اور اگر گناہ بھی ہے تو ایسا کیا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ۔ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بینک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔"

غالب نے برأت کے لئے کیسی مدلل بات لکھی ہے۔ اس میں واقعیت اور زندگی آج بھی اتنی ہی ہے جتنی ان کی زندگی میں تھی۔ سچ یہ ہے کہ یہ سکہ غالباً استاد ذوق نے کہہ کر گذرانا تھا اور مولوی محمد باقر کے اخبار میں شائع بھی کرا دیا تھا۔ اتفاق وقت کہ یہ اخبار مرزا غالب کے ہاتھ نہیں آسکا ورنہ وہ اپنی گلو خلاصی کرا لیے ہوتے۔

یوں تسلی دی

غالب کی صنعت گوئی اور صنعت خاص یہ ہے کہ انہوں نے آہ و بکا کے ماحول میں بھی دل آویزی اور تمسخر کو گلے لگائے رکھا۔ غدر نے گھر کے گھر شہر کے شہر تباہ کر دیئے تھے۔ غالب اور ان کا گھر کیسے محفوظ رہا اس تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"بیگم نے بغیر مجھ سے کہے ہوئے قیمتی اشیاء مثلاً زیور، کپڑے جو کچھ تھے چھپا کر کالے صاحب پیرزادہ کے مکان بھجوا دیئے۔ تاکہ وہاں تہہ خانے میں محفوظ رہیں اور دروازہ مٹی سے بند کرا دیا۔ جب لشکر کشوں نے شہر فتح کیا اور سپاہیوں کو لوٹ کا حکم ملا تو اس راز کے راز داں نے مجھے بتلایا۔ مگر اب وہ ہاتھ سے جا چکا تھا۔ میں نے افسوس کیا اور یوں تسلی دی کہ جانے والی چیز تھی، اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئی۔"

(اردوئے معلی)

یہ طفل تسلی سہی لیکن اس واقعہ اور اس تحریر سے غالب کی سیر چشمی کا اظہار بھی ہوتا ہے ورنہ ممکن تھا وہ گالیاں دیتے۔ کوسنے دیتے اور برا بھلا کہتے۔ لیکن ان سب بدعتوں کے برخلاف انہوں نے شکوہ کے بجائے شکر و صبر سے کام لیا۔

دوسرا امیر مہدی

خط بنام مہدی مجروح۔

"۔ صاحب قصور تمہارا ہے، کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو، جہاں دوسرا امیر مہدی بھی ہو، مجھکو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا۔ نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا۔ نہ اپنا ہم تخلص بہم پہنچایا........"

اس تحریر میں جو ظرافت اور حقیقت نگاری ہے، اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ لطف ہی لطف طنز ہی طنز اور حقیقت ہی حقیقت ہے۔

ٹوپی

غالب کی شخصیت کے اس رخ پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ "سودا اور ذوق نے شملہ باندھا۔ ناسخ ننگے سر رہتے تھے۔ انشا نے چوگوشیہ ٹوپی اختیار کی تھی۔ میر انیس دوپلی ٹوپی پہنتے تھے مرزا مظہر جان جاناں کشتی نما کار چوبی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ میر مصحفی اور مومن خاں بھی کسی نہ کسی وضع کی ٹوپی استعمال کیا کرتے تھے۔ لیکن غالب نے اپنی ٹوپی کو جو انفرادیت بخشی، وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوسکی۔ مغلئی انداز کی بلکہ تاتاری نسل و وضع کے طرز پہ لانبی سی کلاہ نما ٹوپی سب سے پہلے غالب ہی کے سر پہ دکھائی دی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے موجد اور پہننے والوں کی تفصیل بھی مرزا غالب کے استعمال کی وجہ سے تحقیق طلب نہ رہی۔

ان ہی اوصاف سے غالب میں خود نمائی بھی پیدا ہوئی تھی۔ اور ان کی خودی ہی تھی۔ جس نے ان سے یہ کہلوایا:۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

سبد چین

غالب کو فارسی الفاظ و عبارت پر جو عبور حاصل تھا۔ واقفیت و علمیت پر جو بھروسہ تھا اس کی وجہ سے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کسی نے ان سے لفظ سبد چین کے معنی دریافت کئے تو جواب دیا کہ:۔

"سبد چین اس میوہ کو کہتے ہیں جو آخر موسم میں درخت پر رہ جاتا ہے اور جس کے اتار لینے کے بعد ٹہنیاں بے برگ و بار ہو جاتی ہیں"

اسی نام کو بعد میں انہوں نے اپنے فارسی اشعار کے مجموعہ انتخاب کے لئے پسند کر لیا اور یہ نام ایسا موافق آیا کہ پھر کسی نے اس کی تقلید نہیں کی۔

نذر کہاں سے لاؤں

غدر کے سبب غالب کی پنشن اور دربار سے جو خلعت ملتا تھا وہ بند کر دیا گیا تھا۔ مرزا نے اس کی اپیل ملکہ وکٹوریہ اور گورنر جنرل سے کر رکھی تھی۔ اس سلسلے میں وہ ایک خط میں اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

سب سے بڑھکر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار (لال قلعہ) میں جایا کرتا تھا۔ خلعت فاخرہ پاتا تھا۔ وہ صورت اب نظر نہیں آتی، نہ مقبول ہوں، نہ مردود، نہ بے گناہ ہوں، نہ گنہ گار، نہ مخبر ہوں، نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو کہ یہاں دربار ہو اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں!۔

دو مہینے رات دن خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا۔ محمد فضل مصور کو دے دیا وہ پہلی بار دسمبر کو مجھے دے گا۔ یہ اس کا مطلع ہے۔۔۔۔

زسال نو دگر آئی بر گوے کار آمد
ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

اس میں التزام اپنی تمام سرگذشت لکھنے کا کیا ہے۔

(خط بنام یوسف مرزا ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء)

ناامیدی کی پوٹ

پنشن اور دربار و خلعت کی محرومی نے ان کو انگریزوں کی جبہ سائی کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ پھر بھی غالب کو نئے اور متروک الفاظ کے استعمال کا بڑا عمدہ سلیقہ تھا۔ اس سلسلے میں لفظ "پوٹ" کس خوبی سے انہوں نے استعمال کیا ہے " ملاحظہ ہو۔

"پنجشنبہ ۲۹ دسمبر۔ پہر دن چڑھے لارڈ صاحب (لارڈ کیننگ سے مراد ہے) یہاں پہنچے۔ کابلی دروازے کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اس وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو کر گیا۔ میر منشی سے ملا۔ اس کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سن کر ناامیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا.....

(خط بنام مہدی مجروح یکم جنوری ۱۸۶۰ء)

بیسنی روٹی

مرزا غالب کو بیسنی روٹی نہایت درجہ مرغوب تھی۔ خود کہا کرتے تھے کہ بیسنی روٹی کھانے کے بعد نیند زیادہ آتی ہے۔ شاہی مطبخ لال قلعہ سے بھی خاص طور پر جب روٹی آتی تو بڑی خستہ ہوا کرتی ایک قطعہ میں اس کا تذکرہ کس نرالے انداز میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

یہاں بھی غالب اپنی شوخی اور ظرافت سے باز نہ آیا ہنس چھوڑا اور یہی انکا وصف و کمال ہے۔

عشق پہ داغ

غالب کی جدت طبع دیکھئے کہ وہ اپنے محبوب کے حصول کے لئے رقیب کا احسان لینا عشق پر داغ لگانے کے مترادف خیال کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔

عشق مزدوری عشرت گہہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

کتنا بلیغ تصور ہے اور اچھوتا۔

مغل بچے

"بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی۔ کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں"۔

یہ خط مرزا نے حاتم علی مہر کے نام لکھا ہے۔ مہر ایک طوائف غالباً مغل جان سے تعلق رکھتے تھے، مرزا طوائف سے مل چکے تھے۔ اور اس عہد میں یہ بات معیوب نہیں خیال کی جاتی تھی۔ لیکن تعزیت کا ایک نیا انداز مرزا غالب نے ایجاد کیا۔ یہی بات اس تحریر کی خوبی ہے۔

سیرِ صحرا

غدر نے دہلی کو اور دہلی میں مرزا غالب کو جس اذیت و پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی داستان سرائی کا یہ موقع نہیں لیکن ان حالات سے غالب پر رجائی اثرات مرتب ہو گئے تھے۔

چنانچہ یادگارِ غالب میں ان کی زبان سے ادا کردہ یہ تحریر ملتی ہے۔

"میری آرزو یہ ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ للعالمین دل داروں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے۔ نجات پاؤں اور بغیر اس کے کوئی منزل مقصود قرار دوں۔ سیرِ صحرا نکل جاؤں۔

آرزو اور تمنا میں جو محرومی اور مایوسی کی کسک پوشیدہ ہے' وہ پڑھنے والے پر خود آشکارہ ہو جاتی ہے۔ لیکن گریز کا کیا اچھا طریقہ نکالا ہے۔

پھیکا شربت

ایک خط کے یہ جملے ملاحظہ ہوں

"غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں ایک دریا ہے کوسی۔ سبحان اللہ۔ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ پھیکا شربت ہے۔ صاف۔ سبک۔ گوارا۔ سریع النفوذ —"

غالب کی اس تحریر میں جو طنز یا حقیقت مشترک ہے اس کی

داد کون دے۔ لیکن پانی کی مٹھاس کی رعایت سے "پھیکا شربت" کا جملہ کس قدر خوبصورت ہے۔ یہ خط مرزا نے رام پور سے روانہ کیا تھا۔

سُنّی مسلمان

غالب کی صنعت گری یہ ہے کہ انہوں نے بات میں بات پیدا کرنے کا ہنر بہم پہنچا لیا تھا۔ روزہ نہ رکھنا۔ نماز نہ پڑھنی۔ احکام شریعہ پر عمل نہ کرنا اور بات ہے مگر ان کے لئے جواز پیدا کر لینا دوسری بات ہے۔ غالب نے اسے فن کا درجہ بخشا تھا۔ چنانچہ رمضان کے دنوں میں ایک سہ پہر بیٹھے ہوئے مشروب پی رہے تھے۔ ان کے ایک ملاقاتی آ گئے۔ ان کو علم نہ تھا کہ مرزا ایسا بھی کریں گے۔ حیران ہو گئے اور مرزا غالب سے پوچھ بیٹھے ــــ

ملاقاتی:۔ کیا روزہ نہیں ہے؟۔

غالب:۔ (برجستہ) ہے مگر سنی مسلمان ہوں چار گھڑی دن رہے روزہ افطار کر لیتا ہوں۔

اس جواب میں جو ظرافت کا پہلو ہے وہ تو اہل فقہ ہی زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ عام بات یہ ہے کہ اہل شیعہ حکم قرآن کے مطابق (فقہ شیعہ) جب سیاہی نصف آسمان پر آ جاتی ہے، تب افطار کو جائز سمجھتے ہیں لیکن اہل سنت (فقہ حنفی) اس حکم قرآنی کے مدنظر صرف غروب آفتاب ہی کو حد خیال کرتے ہیں غالب نے مسلمانوں کے اس نزاعی مسئلے سے کتنا فائدہ اٹھایا اس کی تفصیل میں کون جائے۔

روزہ بہلانا

غالب نے اپنے طنز و ظرافت کے تیر و نشتر سے کسی کو معاف نہیں کیا نہ بندوں کو، نہ خدا کو۔ نہ خداوند کو، نہ احکام خداوندی کو۔ اس سلسلے کے دو واقعہ ملاحظہ ہوں۔

۱۔ دھوپ بہت تیز ہے، روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔

۲۔ اسی طرح میر مہدی مجروح کو ایک خط میں رقم طراز ہیں۔

"میاں" بے رزق جینے کا ڈھنگ مجھے آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا۔ آگے خدا رازق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔

مزاح پہلی عبارت میں طنز دوسری عبارت میں۔ یہی غالب کی زندگی کا ماحصل ہے۔ غم کھانا نیا محاورہ ایجاد کیا۔ اور اس کا استعمال کس خوبی سے کیا ہے۔

داغ جگر سوز

تعزیت اور افسوس و ملال، رنج و صدمہ کی کیفیات اور اظہار کا کام بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ علاءالدین احمد خاں علائی، جو بیگم غالب کے بھتیجے تھے۔ ان کے نوزائدہ بچے کا انتقال ہو جاتا ہے علائی نے قطعہ تاریخ وفات کی فرمائش کی۔ اس کا جواب غالب کی جانب سے دیا جاتا ہے۔

:" آج بدھ کے دن، ۲۷ رمضان کو پہر دن چڑھے، کہ جس وقت میں کھانا کھا کر باہر آیا تھا، ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط اور شہاب الدین خاں کا خط ملا لایا، مضمون دونوں کا ایک۔ واہ کیا مضمون۔ ان دونوں میں کہ سب طرح کے رنج و عذاب فراہم ہیں۔ ایک داغ جگر سوز یہ بھی ضرور تھا۔ سبحان اللہ میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی یا ولادت کی تاریخ سنی یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی۔ پروردگار تم کو جیتا رکھے اور نعم البدل عطا کرے۔"

علائی خاں کے اس بچہ کا نام یحییٰ تھا۔ غالب نے تاریخ وفات کا یہ شعر کہا:۔

غم دیدۂ! یبنیمی بیحیٰ تاریخ وفاتش ہم بوستن کرد رواغ لپسر سوختہ دل زما

غالب نے خود اس صنعت گری کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

:"ما" کے عدد ۴۱۔ "دل" کے عدد ۳۴ "ما" میں سے "دل" گیا گویا ۴۱ میں سے ۳۴ گئے۔ باقی رہے ۷۔ وہ "داغ پسر" پر بڑھائے ۱۲۷۴ہ باقی آئے۔"

علائی کا ایک تخلص غالب نے اپنی جانب سے شمسی بھی دے رکھا تھا۔ کبھی علائی مولائی بھی کہتے۔ یہاں مقصود یہ کہ تعزیت کا کیا اچھوتا انداز نکالا، خط کی ابتدا میں ۲۷ رمضان، بدھ کا دن، وقت دوپہر اور آخر میں سال تحریر ۱۲۷۵ھ لکھ کر ایک نیا آہنگ بخشا۔

پھر ہم کہاں

غالب کے ہم نواؤں اور رہنماؤں میں خواجہ غلام غوث بے خبر کا نام سرفہرست ہے۔ چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کے بعد بے خبر ہی کی ذات تھی جس نے غالب کے خطوط کی ترتیب کا عام بندوبست کیا اور ان کی اشاعت کا خیال بھی عام کیا۔ غالب ان کو ایک خط میں اپنی زندگی اور موت کی خبر یوں دیتے ہیں

۔ آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مقتضی استغنا ہے۔ بس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بہ امید مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہو چلا ہوں۔ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے۔ ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے؟

مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے؟ چاہے الہام سمجھئے، چاہے اوہام سمجھئے۔ بیس برس سے ایک قطعہ لکھا رکھا ہے۔ اب بارہ سو پچھتر ۱۲۷۵ھ ہیں اور "غالب مرد" کے بارہ سو ستتر ہیں۔ اس عرصہ میں جو کچھ مسرت پہنچنی ہو پہنچ لے۔ ورنہ پھر ہم کہاں؟ ۔ (۳ جنوری ۱۸۵۹ء)

غالب کی وفات اس تحریر کے ٹھیک دس سال بعد ہوئی۔ لیکن انکی ظرافت کی انتہا ملاحظہ ہو کر اپنی وفات کی تاریخ خود کہی اور خود ہی مشتہر کر رہے ہیں بلکہ آرزوئے مرگ میں جی رہے ہیں

لم یلد ولم یولد

غالب کی سات اولادیں پے در پے ہوئیں مگر سال سوا سال سے زیادہ کوئی اولاد زندہ نہ رہی۔ اس کا انہیں قلق تھا چنانچہ ایک بار امین الدین احمد خاں نے ان کو لوہارو بلایا[1] غالب اپنی مجبوری اور بڑھاپے کی شدت کی سبب معذور تھے۔ اس لئے معذرت کا یہ انداز اختیار کرتے ہیں:

"واللہ نہیں آسکتا، باللہ نہیں آسکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں، دوست نہ سہی، دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی۔ عداوت بھی تو نہ ہوگی۔ آج تم دونوں بھائی[2] اس خاندان میں شرف الدولہ[3] اور فخر الدولہ[4] کی جگہ ہو، میں لم یلد ولم یولد[5] ہوں۔ میری جورو[6] تمہاری اماں، میرے بچے[7] تمہارے بچے ہیں، خود[8] جو میری بھتیجی ہے۔ اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے۔ نہ تمہارے واسطہ بلکہ ان بے کسوں کے واسطے تمہارا دعا گو ہوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے۔ اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے[9] رہو اور میں تم دونوں کے سامنے مر جاؤں تاکہ اس قافلہ کو اگر روٹی نہ دو گے تو جینے تو دو گے۔ اگر جینے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے۔ میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان ملک زدوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔"

اس تحریر میں مایوسی، بے بسی اور یگانگت، قرابت داری کا جس طرح اظہار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

---

[1] امین الدین خاں و ضیاء الدین خاں۔ [3] شرف الدولہ قاسم خاں [4] فخر الدولہ احمد بخش خاں [5] اپنے لاولد ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ [6] امراؤ بیگم۔ [7] باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں جو زین العابدین خاں عارف کے بیٹے اور بیگم غالب کے رشتہ دار تھے۔ [8] مرزا یوسف خاں کی لڑکی جو علی بخش خاں رنجور ابن الٰہی بخش خاں معروف یعنی غالب کے خسر کے لڑکے غلام فخر الدین سے منسوب تھیں۔ [9] اتفاق دیکھئے کہ یہ بھی ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔

میرا آئین نہیں

مرزا غالب سے ان کے عزیز خاص مرزا علائی نے لوہارو سے کلام تازہ کی فرمائش کی۔ غالب اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں :-

: اشعار تازہ مانگتے ہو۔ کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا۔ مدحتی کرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، مدحتی متروک۔ نہ غزل۔ نہ مدح۔ ہزل و ہجو میرا آئین نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔"

اس خط میں غالب نے اپنی استادی کا اظہار جس خوبی سے کیا ہے۔ اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ ساتھ ہی ساتھ امر واقعہ کا اظہار بھی کر دیا ہے کہ قصیدہ کہنا ان کے مزاج کے خلاف بات تھی، شعر وہ اپنے لئے کہتے تھے لیکن معاشی بدحالی نے غم جاناں سے غم روزگار کی فکر میں مبتلا کر رکھا تھا۔ پھر ضعیفی صد عیب۔

رجب بیگ مرے

غالب کا فن یہ ہے کہ وہ جو بات کہنی چاہتے ہیں، اس میں لاگ اور لگاؤ کو درمیان میں نہیں آنے دیتے۔ ہیر پھیر میں بھی وہ انداز اختیار کرتے ہیں جس میں جدت طبع کا اظہار ہو۔ دیکھئے ایک معمولی بات کو کس انداز میں کہا ہے۔

"لو صاحب۔ وہ مردِ ارجب بیگ مرے۔ ان کی تعزیت آپ نے نہ کی۔ شعبان بیگ پیدا ہوگئے۔ کل ان کی چھٹی ہو گئی۔ آپ شریک نہ ہوئے؟"

(۷، شعبان ۱۲۸۱ھ)

مطلب یہ کہ رجب کا مہینہ آیا اور ختم ہو گیا۔ شعبان کا مہینہ آگیا اور چھ تاریخ گزر گئی۔ آپ نہ آئے۔ یعنی کوئی خط نہ آیا۔ شکوہ کا کیا اچھا طریقہ ایجاد کیا ہے۔

ہائے دلی

مرزا غالب نے اپنی تحریروں میں جو تحریری کمالات دکھائے ہیں، ان کی بے پناہ مثالیں جمع کی جا سکتی ہیں۔ ایک ملاحظہ ہو۔

"ادمیاں سید زادہ آزادہ۔ دلی کے عاشق دلدادہ۔ ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھوں میں حیا و شرم، نظام الدین ممنون کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی، نہ سخندانی۔ کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی وائے دلی۔ بھاڑ میں جائے دلی۔"

غالب نے میر مہدی مجروح کو یہ خط ۲۲ فروری ۱۸۶۱ء کو لکھا تھا اس تحریر میں جہاں زبان کا لطف ہے، وہیں حسرت و یاس کی تصویر بھی پنہاں ہے۔ اپنے ان ہی رفیقوں کی جدائی سے ملول و رنجیدہ ہو کر غالب نے ایک خط میں لکھا تھا کہ "میرے ہم عمر مرے جاتے ہیں" ہم عمروں کی موت ان کے لیے بڑی جان لیوا تھی۔ اور اس کرب کا اکثر ذکر اُن کے خطوط میں ملتا ہے۔

آدمی کہاں

منشی شیو نرائن، آرام نے اکبر آباد سے مرزا غالب کو خط لکھا کہ ان کے اخبار کے لیے دہلی میں خریدار فراہم کریں۔ منشی صاحب نے "مفید خلائق"، "آفتاب عالمتاب"، "معیار الشعرا" اور "بغاوت ہند" کے نام سے کئی اخبارات نکالے۔ غالب کے دوستوں میں تھے "دستنبو" کا پہلا اڈیشن ان ہی کے مطبع "مفید خلائق" سے شائع ہوا تھا۔ غالب نے منشی شیو نرائن، آرام کے مذکورہ خط کا جواب یہ دیا

یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں، یہ ڈھونڈتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں؟ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے۔؟"

اس خاکہ میں جس ذہنیت کے لوگوں کا مذاق اڑایا گیا ہے، وہ ذہنیت عہد غالب سے اب تک بدستور رہے۔ سب کچھ بدل گیا۔ یہ ذہنیت نہ بدلی۔ ہندوستانی خمیر میں روایت پرستی۔ یدرجۂ اتم موجود ہے — "۔ ۔ ۔

بی وفادار

غالب کی ایک ملازمہ "بی وفادار" بھی تھی، جسے امراؤ بیگم نے اس کی بعض خصوصیات کی بنا پر "وفادار بیگ" کا نام و خطاب دے رکھا تھا مگر ملازم اور ملازمہ کا جو طریقہ ہوتا ہے "بی وفادار" بھی اس سے مختلف نہ تھیں، کام میں تساہلی، رتا نیز ٹال مٹول بھی کچھ کرتی ہوں گی۔ اس سلسلے میں غالب کو زبان نے ان کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ ملاحظہ ہو:۔

نہ باہر نکلتی ہیں۔ سو ان کو کب لائیں گی۔ مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ اطراف شہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور یہ نہ کہیں کہ "یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے (مرزا امین الدین احمد خاں) کی کیاری (کیاری) کے ہیں۔" (۶ ماہ اگست ۱۸۶۲ء)

اس میں واقعہ جو ہو، سو ہو مگر مزاحیہ نگاری کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

غالب کا مذہب

حالی کا بیان یادگار غالب سے :۔

:۔ ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں کہا۔ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں۔ جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی تھی۔

ان میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے مجھ کو یاد رہ گئی ہے، جو یہاں لکھی جاتی ہے :۔

رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی،
شیعی کیوں کر ہو، ماوراءالنہری

اس رباعی کی تشریح کے بعد حالی لکھتے ہیں :۔

:۔ جو لوگ مرزا کی طرزِ مزاج اور طرزِ کلام سے نا آشنا ہیں۔ وہ شاید سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لیے اپنا مذہب غلط بیان کیا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رباعیاں صرف بادشاہ کو خوش رکھنے اور اہلِ دربار کو ہنسانے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ کیوں کہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم از کم تفضیلی نہ جانتا ہو،،۔

:: یہی نہیں خود غالب کا بیان ہے۔

:۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمۃ العالمین۔ منقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے، ثم حسنؑ، ثم حسینؑ۔ اسی طرح تا مہدی موعود السلام۔

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

غالب نے اپنے دینی عقائد کو کبھی پوشیدہ نہیں رکھا۔ نثر میں نظم میں ہر طرح اس کا اظہار کیا اور بار بار کیا۔ اور حضرت رسولؐ کے بعد حضرت علیؓ کو تمام انسانوں میں افضل خیال کرتے تھے، ان کو خلیفہ ماننے سے انکاری اور امام تسلیم کرنے پر راضی تھے۔ نہ صرف راضی تھے بلکہ اقرار کرتے تھے۔ لیکن ان کا کفن و دفن سنی طریقہ پر ہی ہوا۔ جس میں ہر فرقہ کے لوگ شریک تھے۔

غالب کی حیثیت

غالب کی عمر ۵ سال کی تھی کہ ان کے والد عبداللہ بیگ کا انتقال ہو گیا، باپ کے انتقال کے بعد ان کے چچا (مرزا نصراللہ بیگ جو لارڈ لیک کے ملازم تھے) نے ان کی پرورش کی۔ جن کی تحویل میں سونک اور سونسا کے علاقے تھے۔ وہ ایک معرکہ میں (غالب کی عمر ۸ سال کی تھی) ہاتھی سے گر کر فوت پا گئے تو ان کے سالے نواب احمد بخش نے ان کے متعلقین کی پرورش اپنے ذمہ لی اور لارڈ لیک نے فیروزپور۔ جھرکہ اور لوہارو کا علاقہ ان کو بخش دیا۔ شرط یہ تھی کہ ۲۵ ہزار روپے سالانہ وہ حکومت کو ادا کیا کریں گے۔ لیکن نواب احمد بخش نے یہ تجویز رکھی کہ وہ دس ہزار روپے سالانہ نصراللہ بیگ کے متعلقین پر صرف کریں گے۔ بقیہ خود اپنے اپنے صرف میں لائیں گے۔ لارڈ لیک نے اس تقسیم کے مطابق ۲۵ ہزار سالانہ کی رقم معاف کر دی مگر بعد میں نواب نے نصراللہ بیگ کے متوسلین پر خرچ ہونے والی رقم کو نصف کرا دیا اور اس کی تقسیم یوں کی :-

خواجہ حاجی ۱-۲ ہزار روپے سالانہ (ملازم فوج حلقہ نصراللہ بیگ)

نصر اللہ بیگ کی ماں : ۱½ ہزار روپے سالانہ
اور تین بہنیں

مرزا غالب و یوسف مرزا : ۱½ ہزار روپے سالانہ

مرزا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین کمیندان اکبرآبادی بھی کافی جائداد کے مالک تھے۔ غالب کا بچپن ان کے ننہیال ہی میں گزرا۔ چنانچہ اکثر و بیشتر آگرے سے کچھ رقم ان کی والدہ دہلی ارسال کیا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ زندگی بھر پریشان حال رہے قلاش اور معاش کی فکر میں سرگرداں۔

خطاباتِ غالب

مغلیہ سلطنت کے ڈوبتے سورج اور مدھم بلکہ شمع آخری ہونے کے باوجود مرزا غالب کی قدر و منزلت کی۔ اور ان کو شاہ ظفر بہادر شاہ آخری تاجدار مغل کی بارگاہ سے جو خطاب عطا ہوا وہ خطابات میں بے نظیر ہے۔ کیونکہ تین ناموں کے خطابات بیک وقت عطا ہونا کمال قدر و عزت افزائی فن کی بات تھی۔ یہی سبب ہے کہ بادشاہ کی طرف سے

نجم الدولہ
دبیر الملک
نظام جنگ

کے خطابات کے سوا منصب اور خلعت فاخرہ بھی عطا ہوا۔ اگرچہ خود غالب کی نظروں میں ان کی کچھ زیادہ وقعت نہ تھی اور وہ مطمئن بھی نہ تھے۔